تحریک
رجوع الی القرآن

© rasailojaraid.com

(ماخوذ از ماہنامہ میثاق، بابت دسمبر ۱۹۷۶ء)

- خانوادۂ ولی اللّٰہیؒ اور تحریکِ شہیدینؒ
- عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے تبلیغی یلغار
- سرسیّد احمد خاں مرحوم اور آنجہانی غلام احمد قادیانی
- شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ڈاکٹر سر محمد اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- مولانا ابو الکلام آزاد اور سیّد ابو الاعلیٰ مودودی
- امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی

© rasailojaraid.com

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تاثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ "دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں ان کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعۃً دورِ جدید کے فاتح ہیں ......" اور ساتھ ہی تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے ان کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے "اسلام کا رشتہ اس کی 'اصلِ ثابت' یعنی قرآن حکیم سے ساتھ از سرِ نو قائم کرنے کے طویل عمل کا باقاعدہ آغاز فرما دیا" ——— اور یہ کہ "ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات کو از سرِ نو قرآن حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا ——— اور اللہ کی رسّی کے ساتھ اُمّتِ مسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ ——— 'لا یصلح آخر ھٰذہ الامّۃ الّا بما صلح بہ اوّلھا' ——— اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی!"

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اوّل میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں :- ایک ایمان ——— وہ ظاہری اور قانونی و فقہی ایمان نہیں جس کا تعلق 'اقرار باللّسان' سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان جو یقین بن کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے ——— اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو 'شہادت علی النّاس' ——— 'اعلاءِ کلمۃِ اللّٰہ' اور 'اظہارِ دینِ حق علی الدّین کلّہٖ' ——— اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور جہاد و قتال کی علامت ہے تلوار، لہٰذا 'مردِ مومن' کی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

شخصیت کا جو ہیولیٰ چشمِ تصوّر کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

یہ صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی اپنی زندگی میں سر بکف سیف بدست اور کفن بر دوش میدانِ جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا لیکن —— یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غلغلہ سرزمینِ ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر ان ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سید احمد بریلوی بھی خانوادہ ولی اللّٰہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور ان کے دستِ راست تو تھے ہی شاہ اسمٰعیل ابن شاہ عبدالغنی ابن شاہ ولی اللہ۔ اور اگرچہ انجام کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلۂ مستعجل" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشیدگی، یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریکِ جہاد کے وابستگان کے ایمان و یقین، ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرامؓ یاد آ جاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ " ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!" اور یہ ایک بیّن ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس، اور منہجِ عمل وہی اختیار کیا جائے جو اسلام کے صدرِ اوّل میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو دورِ صحابہؓ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ گویا بقول جگر مراد آبادی ؎

چمن کے مالی اگر بنا لیں موافق اپنا شعار اب بھی!
چمن میں آ سکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹھی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلّط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگِ پلاسی کے نتیجے میں ہو گیا تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا۔ تاہم اسے ایک باضابطہ کُل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی یہاں تک کہ

۱۸۵۷ء کے غدر یا بغاوت کی صورت میں آخری ہچکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دور ختم ہوگیا۔ اور تاریخِ ہند کے برطانوی دور کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا نصف اوّل ہند میں سخت اضطراب و انتشار اور شکست و ریخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص حد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار رہے۔ مایوسی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ ؎

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام!

ظاہر ہے کہ تحریک شہیدینؒ ایسی پُرعزیمت دعوت کا پنپنا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا، چنانچہ یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے "بخاک و خون غلطیدن" کی روش اختیار کر لی اور اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر لیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوتِ ولی اللّٰہی کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی ——— اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل ع "من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را!" پر عمل پیرا رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر ریشمی رومالوں کی تحریک تک ممتد ہوا لیکن ظاہر ہے کہ اُن کی مساعی کوئی بار آور نہ ہو سکا ——— اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا۔

برطانوی دور میں مسلمانانِ ہند زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے متعدد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی اور قومی و سیاسی بھی ——— ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (قومی و سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہار رائے کیا تھا۔ یہ مضامین ان شاء اللہ جلد ہی کتابی صورت میں شائع کر دیئے جائیں گے!) ——— مزید برآں یہ چومکھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور ہندوؤں سے بھی!

© rasailojaraid.com

اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اوّلاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے بنی اور ایک طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہو سکی کہ قدم جما کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی کوشش شروع کر سکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہیبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمانانِ ہند میں نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوت۔ لہٰذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی چاہیئے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سُنّتِ الٰہی ظاہر ہوئی کہ ؎

خونِ اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں،
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰؑ طلسمِ سامری!

اور یہ سعادت اسی خطّے کے حصّے میں آئی جس میں علم و حکمتِ ولی اللّٰہی کے چشمے بہہ رہے تھے کہ ضلع مظفر نگر کے قصبے کیرانہ سے مولانا رحمت اللہ نامی شخصیت ابھری جس نے پادری فینڈر (FANDER) کی کتاب "میزان الحق" کا دندان شکن اور مُسکت جواب "اظہار الحق" کے نام سے تحریر کیا۔ نتیجۃً پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دُم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— (اور پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا)۔ مباحثے اور مناظرے میں اس شکستِ فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے میدان میں خم ٹھونک کر کبھی نہ کی جا سکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پسماندہ طبقات کی تالیفِ قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے چپکے سے "مسیح" کا لاحقہ چسپاں کرا دو اور بس!

© rasailojaraid.com

دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آگیا اور مسلمانوں پر اُن کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایک خالص رجعتی اور تنگ نظرانہ انداز میں دوسرے قدرے وسیع المشربی کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ـــــ ان میں سے پہلے کا حشر تو اگرچہ عیسائی مشنریوں کے انجام جیسا ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بیمار جاتے جاتے مریض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جسے عام گھریلو زبان میں بیماری کا "موتنا" کہتے ہیں اسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جسدِ ملت میں ایک سرطان کی جڑیں جما گیا ـــــ رہا دوسرے انداز کا حملہ تو اس نے میٹھی چھری والا کام کیا اور مسلمانانِ ہند کے اچھے بھلے حصے کو متاثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زلف گرہ گیر کی اسیر ہوگئیں۔

اوّل الذکر حملہ ـــــ آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا۔ جنھوں نے ۱۸۶۵ء ہی سے لگ بھگ مسلمانوں کو للکارنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف "ستیارتھ پرکاش" کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عُروج کو پہنچ گیا تھا۔ ان کے جواب کے لیے علماءِ حق بھی میدان میں آئے لیکن بدقسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیت آنجہانی غلام احمد قادیانی کو حاصل ہوگئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف "سرمۂ چشمِ آریہ" ہی کے ذریعے وہ ہردلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی نتیجۃً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

مؤخر الذکر حملہ ـــــ برہمو سماج کی صورت میں سامنے آیا۔ جس کی تاسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی۔ عجیب بات ہے کہ یہ انتہائی ذہین وفطین اور عالم وفاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے "تحفۃ الموحّدین" تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہردلعزیزی حاصل کرلی۔ بعد میں یہ شخص اپنشدوں کا پرچارک، ہندوستان کی عظمت وسطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندی نیشنلزم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبرِ اعظم علیہ ما علیہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دینِ الٰہی

کے حربے کے طور پر "وحدتِ ادیان" کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھّے اچھّوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظلّ اور بروز کی حیثیّت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیّت پر سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے۔ عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں "تحفۃ الموحّدین" تالیف کی اسی طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیّت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اُچھالا کہ مولانا ابوالکلام آزادؔ مرحوم جیسی عظیم اور نابغہ شخصیّت بھی اس کی زلفِ گرہ گیر کی اسیر ہو گئی ؎ "ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں!"

مسلمانانِ ہند کی منضبط احیائی مساعی کا آغاز دراصل بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا سے ہوا۔ یہ مساعی قومی و ملّی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پر اس احیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس ہمہ جہتی عمل کے اس پہلو پر روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدیدِ واحیائے دین اور ٹھیٹھ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے —— اور وہ یہ کہ بحمد اللہ نگاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہوتا جارہا ہے اور اُمّتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجّہ ہو رہی ہے۔

اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور "الفوز الکبیر فی اُصُول التّفسیر" کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ان کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدّینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے علی التّرتیب لفظی و بامحاورہ اردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدّینؒ کا ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادرؒ کا ۱۸۱۰ء میں) —— انیسویں صدی کا اکثر حصّہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا۔ تاہم اس کے اواخر ہی میں "رُجُوع اِلَی القرآن" کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پوری شدّت کو پہنچا۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

رُجُوع الیٰ القرآن کے اس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اس میں ان گروہوں نے بھی حصّہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضَلُّوا وَ اَضَلُّوا کا مصداقِ کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو "ضَلُّوا ضَلٰلاً م بَعِیْدًا" کی اس حد کو پہنچ گئے کہ اُمّت کو مجبوراً ان کا تعلق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اُٹھایا جاتا جیسے چکڑالوی و پرویزی ـــــ تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآن حکیم کی جانب ارتکازِ توجّہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصّہ لیا ہے لہٰذا ان کا ذکر کیا جا رہا ہے ـــــ اسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیئے کہ گذشتہ صدی کے ربع آخر اور موجودہ صدی کے ربع اوّل میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برّ ِصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سر سیّد احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیب الاخلاق' میں تفسیرِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رُک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حیرت دہلوی " " " " " " "

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری " " " " " " "

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی تفسیر شائع ہوئی

(۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابو الفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بلگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا۔ لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ لہٰذا یہ نامکمّل رہ گیا اور شائع نہ ہو سکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمّل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

مختصر حواشی شائع ہوا (حواشی سورۂ نساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے)

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا (اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہوگئے!)

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گذشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہو گیا تھا اور اس صدی کے ربع اوّل کے ختم ہوتے تک خاصی دلچسپی مسلمانانِ ہند کو قرآنِ حکیم اور اس کے علوم و معارف کے ساتھ پیدا ہو چکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں ملتِ اسلامی کی نشاۃِ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطہ ہائے نظر اور طرز ہائے فکر پروان چڑھنے لگے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتدا میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفت مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لئے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور علماء کا حلقۂ اثر سکڑتا چلا گیا۔ تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَوئیں بالکل مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ٥ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ٥ کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی مکتبِ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہ و اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے!!!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اس تفرقہ و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جدّ و جہد پر مترتّب ہوئے وہ ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآنِ حکیم کے جانب توجّہ و التفات کا جو رُجحان پیدا ہوا اس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیٰحدہ علیٰحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ایک متجدّدانہ رنگ کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سر سیّد احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصل الاصول کی حیثیّت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الہند کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیّت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر "فکرِ قرآنی" کے میدان میں خواہ مولوی عبداللہ چکڑالوی کی اہلِ قرآنیت ہو خواہ محمد علی لاہوری کی لاہوریّت اور خواہ علّامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیت ہو خواہ چودھری غلام احمد پرویز کی پرویزیّت، یہ سب فکرِ سر سیّد ہی کی شاخیں ہیں۔ اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی "بیانُ القرآن" پر مبنی تین مزید تفسیریں منصّۂ شہود پر آچکی ہیں، ایک مولانا عبد الماجد دریا بادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصًا بائیبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں دوسری مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ توجّہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتنا کیا گیا ہے۔

جہاں تک متقدّم الذّکر مکاتبِ فکر کا تعلّق ہے، ہمیں ان سے قطعًا کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت و گمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس جائزے میں ان کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمّت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی ہے اگرچہ اُن کے زیرِ اثر یہ دلچسپی غلط رُخ پر پڑ گئی تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اگر قرآنِ حکیم کے حقیقی اور اصلی عُلوم و معارف پیش کئے جائیں تو ان مکاتبِ فکر سے منسلک لوگوں کو بآسانی

© rasailojaraid.com

راغب کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ان مکاتبِ فکر نے گویا ایک دعویٰ (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جوابِ دعویٰ (ANTI-THESIS) کے طور پر راسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ و تفسیرِ قرآن کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا ذخیرہ اُردو تراجم و تفاسیر کا تیار ہو گیا۔ جس سے قرآن مجید کی جانب عوام کی توجہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا ــــ

دبے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہوگا کہ خود علماء کے حلقوں میں تاحال قرآنِ حکیم پر توجہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہٗ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اُصولِ تفسیر پر کُل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا؟ ــــ

اِس کا جواب، تو مولانا نے قدرے توقف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اُصولِ فقہ کی کتابوں میں اُصولِ تفسیر بھی زیرِ بحث آ جاتے ہیں لہٰذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ اِس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دارالعلوم میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصص فی الفقہ کا بھی لیکن تخصص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے؟ تو اس پر مولانا نے پُوری فراخدلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ یہ ہماری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقۂ دیوبند کے علمائے کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الہندؒ کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمد شفیعؒ نے اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا ــــ الا ماشاء اللہ (شیخ الہند کی یہ نصیحت بروایت مفتی محمد شفیعؒ ص۲۱ پر دیکھیں)

بہرحال علی گڑھ اور دیوبند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملتِ اسلامیہ ہند کے محیط میں فکرِ قرآنی کے تین سوتے اور پھوٹے جنہیں مجموعی طور پر SYNTHESIS سے تعبیر کیا جا سکتا ہے

(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علامہ اقبال مرحوم جو معروف و متداول معنوں

© rasailojaraid.com

میں تو نہ مترجمِ قرآن تھے نہ مفسرِ قرآن۔ ان کی تعلیم بھی نہ کسی دارالعلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعۂ اسلامیہ میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔ بایں ہمہ قرآنِ حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومیٔ ثانی' کا ہے، یہاں تک کہ انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ مناجات بحضور سیّد المرسلینؐ میں یہ تک کہہ دیا کہ :

گر دلم آئینۂ بے جوہر است | ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن | ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا | بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سُرور، محبّتِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملّی سے مملو ہیں ہی۔ اُن کے 'خطبات' بھی در حقیقت وقت کی اعلیٰ ترین فکری سطح پر مطالعۂ قرآنِ حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علّامہ مرحوم نے جدید ریاضیات و طبعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآنِ حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گاڑی کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔

علّامہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید کام نہیں کیا۔ البتّہ ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وسیع خدمات سر انجام دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف 'قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے ذریعے بعض جدید اور اہم نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء، فرائیڈ کا نظریۂ جنس، مارکس کا نظریۂ جدلی مادیّت وغیرہ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی۔ اور دوسری طرف "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علّامہ مرحوم کے فلسفۂ خودی کو ایک مرتّب اور منظّم نظامِ فکر کی حیثیّت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی کا مستقبل اسی نظریے کے ساتھ وابستہ ہے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

(۲) برِّ صغیر میں قرآنی فکر کا دوسرا دھارا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت سے پھوٹا جس پر فکر سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ مولانا مرحوم مفسّرِ قرآن کی حیثیت سے تو بہت بعد میں متعارف ہوئے اس لیے کہ 'ترجمان القرآن' کی جلد اوّل ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوئی تاہم اُن کی قرآن حکیم کی ترجمانی اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ کیلئے دعوتِ جہاد کا ڈنکا برِّ صغیر کے طول و عرض میں ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۶ء 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے بج چکا تھا۔ اور اس ضمن میں وہ حضرت شیخ الہندؒ ایسی عظیم شخصیت تک سے خراجِ تحسین وصول کر چکے تھے ـــــــ افسوس ہے کہ ۱۹۲۰ء، ۱۹۲۱ء میں جب بعض علماء کی مخالفت کے باعث مولانا مرحوم 'امام الہند' کے منصب پر فائز ہوتے ہوتے رہ گئے تو ایک شدید ردِّ عمل اُن کی طبیعت میں پیدا ہوا اور وہ ؎

"صور پھونکا گیا تم سو گئے کہاں آخر؟"

کے مصداق اس راہ ہی کو ترک کر انڈین نیشنل کانگرس کی بھول بھلیّوں میں گم ہو کر رہ گئے اور اس طرح کم از کم عارضی طور پر برِّ صغیر میں قرآنی فکر کے اس دھارے کے سوتے خشک ہو گئے! (مزید افسوسناک امر یہ کہ گاندھی جی کی شخصیت کے زیرِ اثر مولانا مرحوم 'وحدتِ ادیان' کے بھی پرچارک بن گئے۔ اور اس طرح گویا 'برہمو سماج' کی تقویت کا ذریعہ بن گئے!)

تاہم 'الہلال' اور 'البلاغ' کی دعوت اتنی بودی اور بے جان نہ تھی کہ اس طرح ختم ہو جاتی۔ چنانچہ اس نے فوراً ہی ایک دوسری فعّال شخصیت کی صورت میں ظہور کر لیا۔ جس نے اوّلاً مولانا آزاد مرحوم کے نعرۂ جہاد کو ایک مبسوط تصنیف کا موضوع بنایا اور 'الجہاد فی الاسلام' ایسی معرکۃ الآراء کتاب بالکل نوعمری میں لکھ ڈالی اور پھر ۱۹۳۲ء سے مولانا آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' کے ہم نام ماہنامے کے ذریعے قرآنِ حکیم کی ترجمانی اور خاص طور پر اس کی انقلابی دعوت کے تسلسل کو باقی رکھا۔ یہ ہیں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جنھوں نے ایک طرف 'قیامِ حکومتِ الٰہیہ' کے نصب العین کے پیشِ نظر ۱۹۴۱ء میں 'جماعتِ اسلامی' قائم کی اور دوسری طرف 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قرآن مجید کی تعلیمات اور خصوصاً اُس کی انقلابی دعوت کا تعارف برِّ صغیر کے طول و عرض میں بالخصوص جدید تعلیم یافتہ نسل کے ایک بہت بڑے حلقے میں کرا دیا ـــــــ اور اگرچہ اس پر جتنا افسوس

© rasailojaraid.com

کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بد دل ہو کر کانٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیامِ پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقّعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کُود پڑے۔ اور پورے بتیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پُوری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پورے کر کے بھی اُنہیں یا اُن کی جماعت کو اس صحرانوردی سے نجات ملے گی یا نہیں؟) ——— اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں 'خلافت اور مُلوکیّت' نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رفض اور تشیُّع کی تقویّت کا موجب بن گئے، تاہم اُن کی خدمات بالکل رائگاں جانے والی نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدّ و جہد میں عملاً مبتلا کیا ہے۔ اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے اُن کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رُخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے۔ تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صُور اُنہوں نے پھُونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابو الکلام آزاد مرحوم ثمّ ابوالاعلیٰ مودودی کی یہ دعوتِ جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ اُبھرے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيز!

(۳) وہ عظیم شخصیّت جس سے برِّصغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا سوتا پھُوٹا، مولانا حمید الدّین فراہیؒ کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج اُن ہی کی ذات میں ہوا[۱]۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اس دور کے چوٹی کے علماء سے فارسی، عربی اور دینی عُلوم کی تحصیل مکمّل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے

---

[۱] چنانچہ امام فراہیؒ کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سیّد سلیمان ندویؒ نے ماہنامہ معارف شمارہ ۱، ۲ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ ہی کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ ؎

فغاں کہ گشت تہی شدہ سخن خاموش ۔۔۔ وگر چگونہ تسلّی کنم من ایں لبِ گوش

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجّہ ہیں: ——— بقیہ اگلے صفحہ پر

© rasailojaraid.com

ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور ذکرِ جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا - اور پھر اُن کی نگاہیں قرآنِ حکیم پر مرتکز ہوگئیں اور انہوں نے باقی پُوری زندگی "حکمتِ قرآنی" کی گہرائیوں میں غوطے لگانے میں بسر کر دی - اور اگرچہ اُن کا مزاج "کمانا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا - چنانچہ اپنی زندگی میں مفسّر یا مُصنّف و مؤلّف کی حیثیّت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالۂ صندوق کرتے چلے گئے - تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

"اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے، وہ کُل وہ تھے، جن کی ولادت اور نشو و نما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں۔ ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی جدید علوم و فنون کی اطلاع و واقفیّت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا - اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سُنی سنائی باتیں تھیں - لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفۂ حال کے متعلق نفیًا یا اثباتًا جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے -

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی شروع کی اور بی - اے اور ایم - اے اور پی - ایچ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ ع "جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اسے صاف دل سے بھُلا دیا" نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الٰہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی مشکل ہی باور کر سکتے تھے مگر وہ، وہ تھے جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں"

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہی میں شائع ہوئیں انہوں نے ان کے "تدبر قرآن" کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماً و فضلاً سے منوالیا اور اُن کی مساعی کا اصل حاصل یہ برآمد ہوا کہ "تدبر قرآن" کا صحیح منہج واضح ہوگیا اور قرآن حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معیّن ہوگیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسّر آگئے جنہیں انہوں نے اپنے طرز پر غور و فکر کی تربیت خود دے کر تیار کر دیا تاکہ وہ اُن کے ابداں کی روشن کی ہوئی راہ پہ آگے بڑھ سکیں۔ اُن کے اِن تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ "حقیقتِ شرک"، "حقیقتِ توحید"، "حقیقتِ تقویٰ" اور "حقیقتِ نماز" ایسی گرانمایہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علمِ کلام کی تدوین کی راہ کھول دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا "حقیقتِ دین" کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں) بلکہ، خواہ عمر کے آخری حصے میں سہی، اپنے استاذ کے اُصول پر باقاعدہ تفسیر "تدبّرِ قرآن"، بھی تحریر کردی (جو اب بحمداللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پر ہیں مولانا صدرالدین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

بے لگام اور مادر پدر آزاد متجدّدین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بَین بَین "فکرِ قرآنی" کے یہ تین دھارے جو برِّ صغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

ان میں سے مؤخر الذکر دو دھارے تو درحقیقت پھوٹے ہی ایک عظیم اور گھمبیر شخصیّت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماً لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علاّمہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنھیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مُربّی کی حیثیّت حاصل ہے ——— ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصّل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علاّمہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا، جس کی

© rasailojaraid.com

تصویب مولانا عبدالماجد دریابادی نے، جنھیں بلا شبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیت حاصل ہے، ان الفاظ میں کی تھی :

"......حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نباضی بُعدِ زمانی اور بُعدِ مکانی دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کرلی! ؎

درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید !......"

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئین پر گراں نہ گذرے گا :

"مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیت ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گمبھیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور ملّی و قومی سیاست حتیٰ کہ رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین سیّد سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی ہمہ گیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیرِ اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو اُن کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلیؒ کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمیدالدّین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہِ راست تو ندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا کا بڑا حصّہ ہے ـــــ اور چونکہ برِّ صغیر کی حالیہ مذہبی فکر کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت پھوٹے ہیں لہٰذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم میں متعدد اُمور بطورِ قدرِ مشترک بھی ہیں مثلاً ایک۔ یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصّہ تھا دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآنِ حکیم سے خاص شغف تھا۔ تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس ـــــ جنھوں نے اپنی 'حنفیت' کی شدّت کے اظہار کے لیے 'نعمانی' کی نسبت

© rasailojaraid.com

کو اپنے نام کا مستقل جزو بنا لیا تھا) تقلید سے یکساں بعید و بیزار تھے اور دونوں کو اصلاً ذہنی و علمی مناسبت امام ابنِ تیمیہؒ سے تھی۔ لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزاد میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزاد کی دینداری میں شکوہ و تمکنت کی آمیزش تھی جبکہ مولانا فراہی پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزاد "ابو الکلام" تھے اور اُن کی شعلہ بیانی خطابت میں ایک لاوا اگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہی نہایت کم گو تھے اور ان کا مزاج ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارتا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزاد کی تحریر میں اصل زور عربیّت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہی کی تحریر نہایت سادہ لیکن مُدلّل ہوتی تھی۔ مولانا آزاد سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی اُن کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہی سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں بھی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک مفکّر کا رہا ـــــ چنانچہ مولانا آزاد طوطیِٔ ہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ 'امامُ الہند' قرار پائے جبکہ مولانا فراہی سے اُن کی زندگی میں بھی اور آج تک صرف کچھ علم دوست لوگ ہی واقف ہو سکے ـــــ لیکن اس کے برعکس مولانا آزاد تو آندھی کی مانند اُٹھے اور بگولے کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی اُن کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قندیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہی ایک مستقل طرزِ فکر، اور مکتبِ علمی کی بنیاد رکھ گئے۔ جن کا نام لیوا ایک ادارہ "دائرۂ حمیدیہ" کے نام سے ہندوستان میں اور ایک انجمن مولانا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

© rasailojaraid.com

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے اختلاف کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورۂ فاتحہ اردو ادب کا تو شاہکار (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقّع ہے۔ پھر سورۂ کہف کے بعض مباحث میں اُن کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہمہ قرآن حکیم کا کوئی مرتّب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظمِ قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبّرِ قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اُصول و قواعد از سرِ نو مرتّب و مدوّن کئے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تا حال مسوّدات ہی کی صورت میں ہیں) خالصتاً قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد رکھ دی ——"

قصّہ مختصر —— علّامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدّین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے مابین قُرب و یگانگت کا بھی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے "قیامِ حکومتِ الٰہیہ" کے نصب العین کے پیشِ نظر "جماعتِ اسلامی" کی تاسیس کی تو ان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ اور مولانا صدر الدّین اصلاحی لبیک کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دو ارشد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی —— "من نیز حاضر می شوم ....." کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس "قِران السعدین" سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف "دعوتِ دین اور اس کا طریق کار" ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمّق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزاد مرحوم کا داعیانہ جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدر الدّین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے "فریضۂ اقامتِ دین" —— "حقیقتِ نفاق" —— اور "اساسِ دین کی تعمیر" وغیرہ۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

رہا "فکر قرآنی" کا اوّل الذکر دھارا جس میں علّامہ اقبال مرحوم کو تن تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا لقبیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد دکن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و شاداب خطّے میں اقامت گزیں ہونے کی دعوت علّامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علّامہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں واحد شیدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔

مزید برآں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیّت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور جماعت دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا، بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علّامہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں [illegible] بیج کی منتظر تھی کہ کوئی آئے اور بیج ڈالے اور یہ اپنے خزانے اُگل کر رکھ دے۔ بالخصوص پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس "دگر دانائے راز" کیلئے چشم براہ تھا جس کا ذکر بہ شدید حسرت و یاس علّامہ مرحوم نے مرتے دم کیا تھا!

شاہ ولی اللہ دہلوی کی قرآنی خدمات

کے موضوع پر

شیخ محمد اکرام کی تالیف "رودِ کوثر"

سے ایک اقتباس صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ فرمائیں

© rasailojaraid.com

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا موسّس اور

- اس کے فہم قرآن کے ابعادِ اربعہ'
- اُن سلاسلِ اربعہ کے اعاظمِ رجال سے اُس کے روابط' ——— اور
- دو اہم شخصیّتوں سے وصل و فصل کی داستان ———

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اِن سُطور کے ناکارہ و ناچیز راقم کو اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نوجوانی ہی کے دَور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیئے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق 'فکرِ قرآنی' کے متذکرہ بالا تینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیّر احمد عثمانیؒ کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیرِ قرآن کی حد تک ان علماءِ ربّانیّین کے حلقے سے بھی قائم ہو گیا جو بلا شبہ "الرّاسخون فی العلم" کہلانے کے مستحق ہیں ——— نتیجۃً بفضل اللہ وعونہٖ اس کی ذات میں بقدرِ وسعتِ ظرف اِن 'انہارِ ثلٰثہ' کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا 'چشمۂ صافی' بھی رواں دواں ہے ——— فللہ الحمد والمنّۃ'۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیّت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علامّہ اقبال مرحوم کے اردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی اسکول کا پورا زمانۂ طالب علمی (۱۹۴۱ء تا ۱۹۴۷ء) احقر نے بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے اشعار پڑھتے اور گنگناتے ہوئے بسر کیا۔ جس سے ایک جذبۂ ملّی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہرِ اتمّ کی حیثیّت تحریکِ پاکستان کو حاصل تھی لہٰذا اس دَور میں اپنی بساط کے مطابق عملی وابستگی تحریکِ مسلم لیگ کی تنظیمِ طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی ——— تاہم اسی دَور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور 'الہلال' اور 'البلاغ' والے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے بھی ——— مولانا مودودی کی تحریروں میں سے یوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمد للہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی و قلبی رشتہ 'تفہیم القرآن' کے ذریعے قائم ہوا جس کے ضمن میں تقسیمِ ہند کے قریب کے زمانے میں ماہنامہ 'ترجمان القرآن' میں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ اس ذہنی و قلبی تعلّق کی گھمبیری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تقسیمِ ملک

© rasailojaraid.com

سے ہنگاموں اور آگ اور خون کی وادیوں سے گذر کر جیسے ہی پاکستان پہنچنا نصیب ہوا راقم ان کی تحریک سے وابستہ ہو گیا اور ایک جانب تو اس نے چند ماہ کے اندر اندر ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس طور سے پڑھ ڈالا کہ مولانا محمد اسمٰعیل گوجرانوالویؒ کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی تصانیف کا "فارغ التحصیل" ہو گیا بلکہ ان کا 'مدرّس' بھی بن گیا۔ اور دوسری طرف زمانۂ طالب علمی کے بقیہ سات سال (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء) ان کی تحریکِ اسلامی کے نذر کر دیئے اور اپنی بیشتر قوتیں اور توانائیاں اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ساتھ عملی وابستگی میں کھپا دیں ـــــ اس دور کے تقریباً وسط میں (۵۰-۱۹۵۱ء کے لگ بھگ) راقم کا ذہنی رابطہ مولانا امین احسن اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا کی تحریروں کے بارے میں جماعتِ اسلامی کے حلقوں میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ ثقیل بھی ہوتی ہیں اور خشک بھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جو قلبی انس راقم کو اس وقت تک قرآن مجید کے ساتھ حاصل ہو چکا تھا اس کی بنا پر اسے ان تحریروں میں نہ ثقل کا احساس ہوا نہ خشکی کا۔ مولانا کی تحریریں کبھی یوں تو راقم نے سب ہی پڑھ ڈالیں لیکن ان کی دو تصانیف سے تو اسے عشق کی حد تک لگاؤ ہو گیا: ایک 'دعوتِ دین اور اس کا طریق کار' اور دوسری 'تدبّرِ قرآن' (جواب 'مبادئ تدبّرِ قرآن' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے)۔ مولانا کی ان تصانیف کے مطالعے سے بلا شائبہ ریب و شک راقم کے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی تعلق میں ایک نئے بُعد و عرض (DIMENSION) کا اضافہ ہوا اور پھر جب ۱۹۵۴ء کے لگ بھگ مولانا کا ترجمہ کردہ 'مجموعۂ تفاسیرِ فراہی' شائع ہوا تب تو راقم کو تفسیرِ قرآن کے اس مکتبِ فکر کے اصل منبع و سرچشمہ تک رسائی حاصل ہو گئی فللہ الحمد ـــــ اسی زمانۂ طالب علمی کے دوران احقر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سے متعارف ہوا (یاد ہو گا، اس کا ایک نہایت اعلیٰ اور حسین و جمیل ایڈیشن کراچی کے بعض اہلِ خیر نے ہانگ کانگ سے طبع کرا کے مفت تقسیم کیا تھا جو بعد میں فی نسخہ پانچ روپے سے لے کر تینتیس روپے تک میں فروخت بھی ہوتا رہا!)۔ مولانا عثمانیؒ کے بظاہر حد درجہ سادہ و سلیس حواشی میں راقم کو فکر و نظر کی جو گہرائی اور گیرائی نظر آئی اور خصوصاً احوالِ باطنی کی جو چاشنی یا بالفاظِ دیگر تصوّف کی جو حلاوت محسوس ہوئی

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اس سے اس کی 'نسبت قرآنی' کو بفضل اللہ تعالیٰ وعونہٖ عرضِ ثالث (THIRD – DIMENSION) عطا ہوگیا ——— اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانۂ طالبعلمی ہی میں اس عاجز و ناکارہ کو نہ صرف یہ کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک اُنسِ قلبی عطا ہوگیا اور مناسبت ذہنی حاصل ہوگئی بلکہ ایک نسبتِ روحانی بھی نصیب ہوگئی اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے (تعلیم و تعلّم) کا ایک شدید داعیہ بھی اس کے باطن میں پیدا ہوگیا چنانچہ اوّلاً جمعیتِ طلبہ کے حلقوں میں اور پھر جماعتِ اسلامی کے ساہیوال اور اوکاڑہ کے حلقے میں اس کے 'درسِ قرآن' کا چرچا ہوگیا۔ اور اس کے بارے میں بالعموم ایک خوشگوار حیرت (PLEASANT SURPRISE) کا سا تأثر ظاہر کیا جانے لگا ——— دورِ طالب علمی کے اختتام کے تقریباً ساتھ ہی راقم کا تعارف ایک تو ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم سے ان کی تالیف 'قرآن اور علمِ جدید' کی وساطت سے ہوا اور دوسرے ایک بالکل 'دوسرے' علّامہ اقبال سے ان کے خطبات (RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM) کے حوالے سے۔ اور راقم کو اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ اس سے اس کے مطالعۂ قرآن کو وہ 'بُعدِ رابع' (FOURTH DIMENSION) ملا جس کی اہمیت زمانۂ حال کے اعتبار سے پہلے تینوں اعراض و ابعاد سے کسی طرح کم نہیں ——— اب خواہ اسے کوئی باندازِ تحقیر راقم کے مطالعۂ قرآن کا 'حدودِ اربعہ' کہہ لے خواہ بطرزِ استہزا اسے اس کا 'مبلغِ علم' قرار دے لے، بہرحال واقعہ یہی ہے کہ راقم کی قرآنی 'سوچ' کا اصل تانا بانا ان ہی 'ابعادِ اربعہ' سے تیار ہوا ہے جن کی محکم اور پختہ اساسات ۶۱-۱۹۶۲ء کے آس پاس قائم ہوچکی تھیں جبکہ راقم کی عمر کُل تیس برس کے لگ بھگ تھی ———

بعد کے چودہ پندرہ سالوں کے دوران اللہ کا فضل و کرم ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان اساسات میں سے کوئی بھی منہدم تو کجا مُضمحل یا شکستہ تک نہیں ہوئی بلکہ بحمد اللہ چاروں ہی کو مسلسل تقویت ملتی رہی اور استحکام حاصل ہوتا رہا۔ اور بجائے اس کے کہ : ع

"جو پڑھا لکھا تھا نیازؔ نے اسے صاف دل سے بھلا دیا!"

کے مصداق کسی نئے زاویۂ فکر سے متعارف ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پچھلی عمر اور اس سے حاصل

© rasailojaraid.com

شدہ نتائج بالکل زائل ہو جاتے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہر نیا اندازِ فکر سابق فکر میں ایک ارتقائی شان پیدا کرتا چلا گیا۔ اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی ـــــ اس ہمہ جہتی استحکام و ارتقاء کے ضمن میں واقعہ یہ ہے راقم سب سے بڑھ کر مرہونِ منت ہے، علامہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا۔ جس کے اعتبار سے علامہ موصوف یقیناً 'رومیِ ثانی' بھی ہیں اور مجسم 'ترجمان القرآن' بھی۔ اور اس سلسلے میں شدید ناانصافی ہو گی اگر ذکر نہ کر دیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم (ٹونکی ثم ساہیوالی) کی ہم نشینی سے اور بعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہ کی صحبت سے۔

الغرض ـــــ راقم کے فکر و نظر پر "ھُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ" کے مصداق ابتدائی اور تکمیلی چھاپ تو ہے علامہ اقبال مرحوم کی ـــــ ان میں سے ابتدائی تاثر زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے 'جذبۂ ملی' اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکرِ جدید کے پس منظر میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا قرآنِ حکیم کی روشنی میں فکرِ جدید کا جائزہ و تجزیہ ـــــ اور ان کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی 'قرآنی دعوتِ جہاد و انقلاب' اور امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کے 'طریقِ تدبرِ قرآن' اور حضرت شیخ الہندؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے 'علمِ راسخ' کے کوثر و تسنیم ایسے چشمے ـــــ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کرے۔ ایک ان پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبت 'اُمّیّت' پر فخر ہے انعامات و اکرامات کی یہ بارش! بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ؏ "اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!"

برِّ صغیر پاک و ہند کے بیسویں صدی عیسوی کے 'فکرِ قرآنی' کے متذکرہ بالا 'سلاسلِ اربعہ'

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

کے اعاظمِ رجال اور "السابقون الاوّلون" کی اکثریت کا انتقال تو راقم الحروف کی پیدائش یا شعور کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا ان کی زیارت سے تو محرومی ہی رہی۔ البتہ ان کے "مُتَّبِعِینَ بِاِحْسَانٍ" کی اکثریت کے ساتھ قریبی تعلّق بلکہ ذاتی و نجی روابط کی سعادت اس عاجز کو حاصل رہی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ [12] سال قبل ہو چکا تھا اور ان کے ساتھ راقم کا ذہنی و قلبی رشتہ کُل کا کُل 'غائبانہ' ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جو نقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں اُن کو الفاظ کا جامہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے مختصر یہ کہ راقم کو امامُ الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیّتِ کبریٰ کا عکسِ کامل اُن کی شخصیّت میں نظر آتا ہے، اس فرق کے ساتھ کہ امامُ الہند کی جامعیّت کا مظہر ان کی تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اُصُول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجیے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہادِ حُرّیت اور تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں ہوا مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہدِ اعظم۔ اور حدیث، فقہ، اُصُول اور کلام کے میدان میں ہوا مولانا سیّد انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغۂ روزگار انسان۔ اور جس کے فہم قرآن اور جذبۂ ملّی کا ظہور ہوا مولانا شبّیر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیّت میں اور جس کے انقلابی کردار نے رُوپ دھارا مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا۔ راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیّت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقّہٗ نہیں پہچانا ——— ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کسی شک و شُبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مُجدّد وہ ہیں! ——— واللہ اعلم!

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سنِّ شُعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینانِ قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرّے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہو سکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبتِ معنوی حاصل ہے۔ بایں طور کہ جب وہ تحریکِ پاکستان کے صفِّ اوّل

© rasailojaraid.c

کے قائد کی حیثیت سے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کر رہے تھے تو یہ خاکسار بھی خواہ ایک طفلِ مکتب کی حیثیت ہی سے سہی مشرقی پنجاب کے ایک ضلع حصار کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی اسکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا ——— بعدازاں ان کے تفسیری حواشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیقِ کار اور معتمدِ خاص مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف البتہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت و محبت سے بھی اس عاجز نے حصہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا محمد یوسف بنوری کی نیازمندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل ہے اور اُن کی شفقت اور نظرِ کرم بھی اس ناچیز کا سرمایۂ افتخار ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بحمداللہ بیگانہ و نا بلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ، اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگردِ رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلفُ الرّشید مولانا عبیداللہ انور کی نیازمندی، اور گاہے گاہے اُن کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل ہے، گویا ؎

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَلَسْتُ مِنْھُمْ لَعَلَّ اللہُ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

علامہ اقبال کے انتقال کے وقت بھی راقم کی عمر کُل چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔ اِس کی ایک ہی توجیہہ ممکن ہے اور وہ اس حدیثِ نبویؐ کی روشنی میں کہ اِس عالمِ فانی میں آنے سے قبل عالمِ ارواح میں جن ارواح کے مابین اُنس پیدا ہو جاتا ہے اُن کے مابین مودّت کا رشتہ اس عالمِ اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے ——— بہرحال علامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلق کم و بیش "مِنَ الْمَھْدِ اِلَی اللَّحْدِ" والا ہے۔ اور اوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تحتانی

© rasailojaraid.com

سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علامہ مرحوم کے اردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش اُن کے فارسی کلام کے ۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفۂ اقبال کے مدوّن و شارح ، اور 'حکمتِ اقبال' کے مصنّف ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے بہت پہلے سے واقف ہیں - اور جب بھی کوئی گفتگو ہوئی یہی محسوس ہوا کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا   مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلّق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا - ('میثاق' کے اس دور کے فائل اس پر شاہدِ عادل ہیں!) اُس زمانے میں 'اسلام کی نشاۃِ ثانیہ : کرنے کا اصل کام' راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا - اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور 'میثاق' کے لیے اپنی تصنیف 'MANIFESTO OF ISLAM' کا ترجمہ اُردو میں خود ہی کرنا شروع کر دیا جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ ؎

"آں قدح بشکست و آں ساقی نماند"

والا معاملہ ہو گیا - یغفر اللہ لنا و لہٗ و یدخلہ فی رحمتہٖ -

اسی طرح کلامِ اقبال کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدّ ظلّہٗ سے جو ذاتی ربط و تعلّق ۱۹۶۷ء میں اُستوار ہوا تھا وہ بحمد اللہ نہ صرف یہ کہ آج تک قائم ہے بلکہ اُمّید واثق ہے کہ آخر دم تک دائم رہے گا - (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعۃً حیرت میں ہیں کہ پروفیسر صاحب ایسے نازک طبع اور تنک مزاج بزرگ سے راقم کا تعلّق کیسے نبھ رہا ہے!) پروفیسر صاحب نے "نشاۃِ ثانیہ" کی جو مفصّل تائید و تحسین تحریر کی تھی وہ تو اکثر قارئینِ 'میثاق' کے علم میں ہے ہی زبانی جو کچھ فرمایا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خود ستائی پر محمول کیا جائے گا -

---

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ویسے تو ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ لیکن راقم کو جس ابوالکلام سے دلچسپی تھی یا ہے یعنی ’الہلال‘ اور ’البلاغ‘ والا ابوالکلام جس کے بارے میں کمال وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا تھا حضرت شیخ الہندؒ نے کہ ”اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا“ وہ واقعۃً ۲۲-۱۹۲۱ء کے لگ بھگ ہی وفات پا چکا تھا اور اس کے معنوی خلیفہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جب اس کے ترک کردہ مشن کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا تو اُسے بجا طور پر اس کی زندگی ہی میں ”مرحوم“ قرار دے دیا تھا ——— تاہم مولانا مرحوم کو دیکھنے کی تمنا راقم کے دل میں مستقل طور پر رہی جسے دو ملکوں کے فاصلے نے بالآخر ۱۹۵۸ء میں حسرت میں تبدیل کر دیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ جس سال مولانا مودودی نے مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر کے ہم نام ماہنامے ”ترجمان القرآن“ کی ادارت سنبھالی وہی راقم کا سنِ پیدائش ہے۔ اور مولانا آزاد کے انتقال کا زمانہ لگ بھگ وہی ہے جب کم و بیش دس سال کی ہم سفری کے بعد راقم کی راہ مولانا مودودی کے راستے سے جدا ہوئی۔

مولانا مودودی کے ساتھ راقم کے وصل و فصل کی داستان نہایت طویل ہے مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۷ء تک نہایت قریبی تعلق راقم کو مولانا کے ساتھ حاصل رہا۔ ان میں سے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے دو سالوں کے دوران جبکہ راقم اسلامی جمعیت طلبہ کے صفِ اوّل کے کارکنوں میں سے تھا، مولانا سے قرب کا یہ عالم تھا کہ راقم جب چاہتا تھا مولانا کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر فوری مشورے کے لیے راقم الحروف نے مولانا سے نصف شب کے لگ بھگ اُن کی خوابگاہ میں بھی ملاقات کی۔ ۱۹۵۰ء میں راقم جماعتِ اسلامی کا رکن بنا اور بدقسمتی سے اس کے فوراً بعد ہی اس نے شدت کے ساتھ محسوس کر لیا کہ جماعتِ اسلامی کی تحریک اپنی اصل اساسات سے منحرف ہو چکی ہے۔ اواخر ۱۹۵۶ء میں راقم نے اپنا وہ مفصل بیان سپردِ قلم کیا جو اب ”تحریکِ جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ“ کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، فروری ۱۹۵۷ء میں اجتماعِ ماچھی گوٹھ میں راقم نے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی ناکام کوشش کی۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اور حالات کی ستم ظریفی نے اس وقت صورت کچھ ایسی پیدا کر دی کہ گویا مودودی صاحب 'لیڈر آف دی ہاؤس' تھے اور یہ خاکسار 'لیڈر آف دی اپوزیشن'! چنانچہ راؤ خورشید علی خاں صاحب نے جو اس زمانے میں جماعت اسلامی کے قائدین میں سے تھے اور اب پیپلز پارٹی کے رکن اور نیشنل اسمبلی کے ممبر ہیں، بھرے اجلاس میں باقاعدہ یہ الفاظ کہے بھی تھے کہ "ڈاکٹر اسرار کو لیڈر آف دی اپوزیشن کی حیثیت حاصل ہے انہیں اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے پورا وقت ملنا چاہیئے!" ——— بہر نوع اپریل ۱۹۵۷ء میں راقم نے جماعت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور اس طرح وہ دس سالہ تعلق ختم ہو گیا ——— اب اس 'فصل' کو بھی بیس۲۰ برس ہونے کو آئے ہیں، اور اس دوران میں بھی اُونچ نیچ کے بہت سے ادوار آئے لیکن ان سب کا حاصل یہ ہے کہ سے

وہ مجھ کو جانتے ہیں' میں اُن کو جانتا ہوں
بس اتنا سا تعلق اب اُن سے رہ گیا ہے

آج سے تقریباً دس سال قبل جب رحیم یار خاں میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے چند حضرات کے اجتماع میں "ایک نئی اسلامی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ راقم نے بعض معروضات 'میثاق' کے صفحات میں مولانا مودودی کی خدمت میں پیش کی تھیں ——— راقم کے احساسات اب بھی بالکل وہی ہیں اور اب جبکہ 'تنظیم اسلامی' کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ دوبارہ تشکیل پا کر سفر کا آغاز کر چکا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان معروضات کو من و عن دہرا دیا جائے ——— وَھُوَ ھٰذَا:

"اس موقع پر بالکل ذاتی حیثیت میں ایک گذارش راقم الحروف جماعتِ اسلامی کے بزرگوں خصوصاً مولانا مودودی کی خدمت میں کرنا چاہتا ہے۔ گذشتہ ڈیڑھ دو سال کے دوران، راقم الحروف کے بعض اقدامات اور اس کی بعض تحریروں سے یقیناً آپ کو شدید تکلیف پہنچی ہو گی۔ لیکن خدا شاہد ہے کہ دل کے کسی بعید ترین گوشے میں بھی ان میں سے کسی اقدام یا تحریر سے آپ کی دل آزاری ہرگز مقصود نہ تھی۔ راقم الحروف کے دل میں اظہارِ دینِ حق اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جذبہ آپ ہی کی تحریروں سے پیدا ہوا۔ اسی جذبے سے سرشار ہو کر طالب علمی کے قیمتی اوقات اور عمر عزیز کے بہترین لمحات آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر جدوجہد

© rasailojaraid.com

کی نذر کیے۔ پھر جب محسوس ہوا کہ آپ غلط رُخ پر چل نکلے ہیں تو ایک بیان کی صورت میں اپنے خیالات کو قلم بند کیا اور آپ سے درخواست کی کہ: "اپنی تو کوئی ایسی خدمت نہیں ہے جس کا واسطہ دے سکوں، آپ ہی کی شفقتیں اور عنایتیں ہیں جن کا واسطہ دے کر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے اس بیان کو پڑھ ضرور لیں"۔۔۔۔۔

ماچھی گوٹھ کے بھرے اجتماع میں سٹیج پر اعلان کیا کہ: "اگرچہ مجھے اپنے موقف کی صحت کا یقین ہے اور امیرِ جماعت کی طویل تقریر میں مجھے کوئی روشنی نظر نہیں آئی۔ تاہم مَیں جماعت میں شامل رہوں گا اس لیے کہ اس کے بغیر مَیں اپنے وجود کا تصور بھی نہیں کر سکتا"۔ لیکن پھر جب کچھ آپ کی عنایتوں میں مزید اضافہ ہوا اور آپ نے اہلِ اختلاف پر ضعفِ ارادۂ بسیط اور ضعفِ ارادۂ مرکّب کی پھبتیاں چست کرنی شروع کیں اور کچھ یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں عضوِ معطل کی حیثیت سے رہنا آخر چہ سود؟ تو یہ کہتے ہوئے ایک بھاری دل کے ساتھ جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی کہ: مَیں جانتا ہوں کہ جماعت کے بہت سے بزرگ مجھ سے بزرگانہ شفقت کا اور کتنے ہی ارکان و متفق مجھ سے حقیقی محبّت کا تعلق رکھتے ہیں۔ جب میں سوچتا ہوں کہ آج اپنے اس اقدام سے میں نہ معلوم کتنوں کے جذبات مجروح کروں گا تو اپنے ہی آپ میں ایک ندامت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اس اقدام پر مجبورًا اس لیے آمادہ ہو گیا کہ اب اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا"! علیحدہ ہونے کے بعد بھی کم و بیش پانچ سال تک شدید اختلاف کے باوجود آپ کے ساتھ وہی قلبی تعلّق قائم رہا جو ایک احسان مند کا اپنے محسن سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ۱۹۶۲ء میں حج کے لیے روانہ ہونے سے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اس قلبی کیفیّت کا اظہار بھی کیا تھا۔ افسوس کہ اس کے فورًا بعد آپ کے دو اقدامات یعنی ایک غلافِ کعبہ کے سوانگ اور دوسرے سہروردی مرحوم سے ربط و تعلّق کی بدولت دل کی یہ کیفیّت برقرار نہ رہ سکی اور ذہنی دوری کے ساتھ ساتھ ایک ایسا قلبی بُعد بھی قائم ہو گیا جس میں رنج کے ساتھ غصّے کی بھی آمیزش تھی۔ اسکے "خلافت و ملوکیت" لکھ کر عمر کے آخری حصّے میں جو کمائی آپ نے کی ہے اُس کی وجہ

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

سے غصّے کی جگہ حسرت نے لے لی ہے حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے بارے میں سوچتے ہوئے دل کانپنے لگتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلنے لگتی ہے کہ :۔ ______

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ باایں ہمہ! اب جب کہ ہم آپ کے کچھ قدیم ساتھی، رفیق اور نیاز مند دین کی چھوٹی بڑی خدمت کے ارادے سے جمع ہو رہے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے خیال کے مطابق ہم آپ ہی کے ترک کردہ مشن کے لیے اُٹھ رہے ہیں۔ اس شیرازہ بندی سے مقصود ہرگز آپ کی مخالفت نہیں ہے۔ اگرچہ فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کہ "اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ" کی رُو سے آپ کی جن باتوں کو ہم غلط سمجھتے ہیں اُن پر لامحالہ تنقید کرنی ہوگی تاہم اس سے مقصود سوائے اصلاح کے اور کچھ نہ ہوگا۔۔۔"

مولانا حمید الدّین فراہیؒ کا انتقال بھی راقم کی پیدائش سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ہو گیا تھا۔ اور غالباً ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء تک راقم مولانا کے نام تک سے واقف نہ تھا۔ بعد میں جب مولانا امین احسن اصلاحی کی وساطت سے ان سے تعارف ہوا اور ان کی تحریریں بھی دیکھنے میں آئیں اور اُن کے حالاتِ زندگی بھی معلوم ہوئے تو اندازہ ہوا کہ واقعتاً ایک نہایت عظیم ہستی تھی جو نہایت خاموشی کے ساتھ قرآنِ حکیم پر غور و فکر اور تدبّر و تفکّر کی ایک بالکل نئی طرح ڈال کر رخصت ہو گئی۔ اُن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ راقم الحروف کے تصوّر میں اُبھرتا ہے وہ سُقراط سے بہت مشابہ ہے۔ ایک حکیم و دانا اور نیک و پارسا انسان جو لوگوں کی تعریف و تحسین اور تنقید و ملامت دونوں سے یکساں بے نیاز ہو اور یا تو خاموش تعقّل و تفکّر میں غرق ہو یا اپنے چند شاگردوں کو نہایت دھیمے طریق پر اور مکالمے کے سے انداز میں اس طرح درس دے رہا ہو جیسے کوئی بزرگ کسی بچّے کی اُنگلی پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا ہے ______ اور راقم اسے اپنی بہت بڑی خوش قسمتی سمجھتا ہے کہ اسے حکیم فراہیؒ کا نہ سہی اُن کے شاگردِ رشید کا قُرب تقریباً رُبع صدی تک حاصل رہا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ تعلق کا آغاز تو مولانا مودودی کی طرح ۴۷ء

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ہی میں ہوگیا تھا۔ (بلکہ راقم نے مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی دونوں کو پہلی بار ۱۹۴۶ء
میں دارالاسلام پٹھانکوٹ میں دیکھا تھا جہاں وہ اپنے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب
کی معیت میں حاضر ہوا تھا) لیکن ۱۹۵۱ء تک یہ تعلق کلیتہً یک طرفہ تھا یعنی صرف ان کی
تقریریں اور درس سن لینے تک محدود تھا۔ تاآنکہ اب سے ٹھیک چھبیس سال قبل نومبر
۱۹۵۱ء کی ایک شام کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں راقم نے اسلامی جمعیت طلبہ
پاکستان کے تیسرے سالانہ اجتماع کے موقعہ پر مولانا کے زیر صدارت اپنی وہ پہلی عوامی تقریر
کی جو اب تک جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا اہم جزو ہے اور "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار"
کے عنوان سے طبع ہوتی ہے۔ راقم کی اس تقریر کی تعریف و تحسین مولانا نے دل کھول
کر فرمائی ——— اور یہیں سے وہ یک طرفہ تعلق، باقاعدہ 'دوطرفہ تعلقات' میں
تبدیل ہوگیا ——— دسمبر ۱۹۵۱ء اور جولائی ۱۹۵۲ء میں جمعیتہ طلباء کی دو تربیت گاہوں
میں راقم ناظم کی حیثیت سے شریک رہا اور مولانا معلّم و مربّی کی حیثیت سے، اس سے
ان تعلقات کی گہرائی و گیرائی میں نمایاں اضافہ ہوا ——— بعد کے چار سالوں کے
دوران میں بے تکلفانہ ملاقاتوں سے یہ تعلق مزید استوار رہا ——— ۱۹۵۶ء میں جماعت
اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مولانا نے راقم کے متذکرہ بالا اختلافی بیان
کی نہایت شاندار الفاظ میں تصویب و تائید کی۔ اس طرح جماعت میں پالیسی کے بارے
میں جو اختلاف رائے ہوا اس کے ضمن میں بھی ع "ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز"
کے مصداق مولانا اور راقم ایک ہی صف میں شامل ہوگئے ——— ۱۹۵۸ء میں
جب مولانا نے بھی جماعت کو خیرباد کہہ دیا اور کسی نئی تعمیر کی فکر میں 'مشاورتوں' کا ایک
طویل سلسلہ شروع ہوا تو اس میں بھی مسلسل ساتھ رہا۔ اور اس سلسلے کا اہم ترین اجتماع
عزیز منیر یہ ہڑپہ میں راقم ہی کے زیر اہتمام غالباً چار روز تک جاری رہا لیکن افسوس کہ
کوئی متفق علیہ نقشہ نہ بن سکا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں راقم ان مشاورتوں کی مسلسل ناکامی سے
بددل سا ہوکر ڈاکٹر مسعود الدین حسن عثمانی کی دعوت پر بغیر مولانا کو اطلاع دیئے کراچی
منتقل ہوگیا تو ایک حد درجہ محبت بھرا شکوہ مولانا نے اپنے ایک مکتوب میں کیا:

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

© rasailojaraid.com

”آپ کے اس خفیہ اقدام کی اطلاع سیال صاحب سے مجھے ہو چکی تھی۔ بہر حال جو کچھ آپ نے کیا اچھا کیا۔ خدا کرے آپ کے مقاصد وہاں پورے ہوں اور آپ کو وہاں دلجمعی کے ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کی فرصت ملے۔ ڈاکٹر صاحب کی رفاقت ان شاء اللہ آپ کے لیے موجب خیر و برکت ہو گی۔ فرزانوں کے ساتھ نباہ مشکل ہوتا ہے، دیوانے گذارے جاتے ہیں۔ آپ دونوں دیوانے ہیں۔ خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو ــــ مجھے جو احساس ہے وہ صرف یہ ہے کہ آپ مجھ سے دور ہو گئے۔ آپ سے ایک قلبی لگاؤ سا ہو گیا ہے، اس وجہ سے اس بات سے تھوڑی سی تکلیف ہے کہ میں نے جتنا ہی کھینچنا چاہا اتنے ہی آپ کھنچتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ کھنچتے کھنچتے کراچی پہنچ گئے۔ خیر صاحب، جہاں رہو سلامت رہو اور دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھو!“

۱۹۵۹ء میں اس خیال سے کہ محض ایک سابقہ تعلق کی بنیاد پر نئی تعمیر ممکن نہیں ــــ اس کی فکری اساسات کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا جانا چاہیے۔ مولانا نے ماہنامہ ’میثاق‘ جاری فرمایا تو، جیسا کہ پہلے بھی ایک موقع پر عرض کیا جا چکا ہے، راقم اس کے اوّلین معاونین میں بھی شامل تھا اور بعد میں بھی مقدور بھر اعانت کرتا رہا اور دوسری طرف کراچی سے والد صاحب مرحوم کی علالت کے باعث واپسی پر ۱۹۶۰ء میں راقم نے منٹگمری (حال ساہیوال)

---

[1] ان ’مشاورتوں‘ پر ایک نہایت دلچسپ پھبتی اس زمانے میں ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم نے چست کی تھی۔ ہوا یوں کہ ملک صاحب علیل تھے، راقم اور مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف ان کی عیادت کے لیے ان کے پارک لین، ٹمپل روڈ والے مکان میں حاضر ہوئے، تو باتوں باتوں میں ان ’مشاورتوں‘ کا ذکر بھی آگیا۔ اس پر ملک صاحب نے یہ لطیفہ سنایا کہ ایک بہت بڑے پیر صاحب نے اپنے خلفاءِ مجاز کی ایک مشاورت طلب فرمائی، اور مشورہ طلب بات یہ پیش کی کہ ع ”عمر یست کہ آوازۂ منصور کہن شد!“ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے، کیا ہم اس کا اعادہ نہ کر دیں؟ ــــ سب لوگوں نے اپنی اپنی رائے پیش کی، کسی نے اثبات میں کسی نے نفی میں، ایک صاحب خاموش رہے۔ حضرت نے ان سے براہِ راست استفسار کیا تو انہوں نے مؤدبانہ گذارش کی کہ ”حضرت میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا منصور نے بھی وہ اقدام کسی سے مشورہ لے کر کیا تھا!“

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۱ پر)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

میں ایک اسلامی ہاسٹل قائم کیا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن کی داغ بیل ڈالی تو مولانا نے ان کے ان کاموں میں بھرپور تعاون فرمایا۔ ہاسٹل کی تجویز پر ایک مفصل تائیدی شذرہ 'میثاق' میں تحریر فرمایا اور حلقۂ مطالعۂ قرآن منٹگمری کی دعوت پر تقریر کے لیے دو بار ساہیوال کے سفر کی زحمت برداشت کی!

۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۵ء تک تقریباً چار سال راقم نے دوبارہ ایک دوسرے سلسلے میں کراچی میں بسر کیے۔ اور اس عرصے میں راقم کا رابطہ مولانا سے بہت کم رہا۔ مولانا نے اس دوران میں بعض دوسرے احباب کے ساتھ مل کر 'مجلسِ دعوت و اصلاح' کی داغ بیل ڈالی۔ لیکن نہ تو یہ بیل ہی منڈھے چڑھی نہ ہی اجتماعی کام کا کوئی اور نقشہ تیار ہو سکا۔ اس سے بد دل ہو کر مولانا نے ذاتی طور پر 'حلقۂ تدبرِ قرآن' قائم فرمایا اور اپنی ساری توجہات چند نوجوانوں کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دیں۔ دوسرے احباب سے ان دنوں مولانا کا رابطہ کمزور پڑتے پڑتے معدوم کے حکم میں آ گیا جس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ 'میثاق' نے پہلے تو کچھ عرصے تک ہچکیاں لیں اور بالآخر بالکل دم توڑ دیا ـــــ یہ حالات تھے جب راقم ۱۹۶۶ء میں دوبارہ واردِ لاہور ہوا میثاق بند پڑا تھا، تفسیر کی جلد اوّل تیار تھی لیکن اس کی طباعت و اشاعت کی کوئی سبیل دُور دُور تک نظر نہ آتی تھی۔ 'حلقۂ تدبرِ قرآن' میں جن نوجوانوں پر مولانا نے شدید محنت کی تھی وہ سب بسلسلۂ روزگار تتر بتر ہو گئے تھے۔ ایک صاحب کسی ٹریننگ کے سلسلے میں انگلستان جا چکے تھے دوسرے صاحب کا تبادلہ ڈھاکہ میں ہو گیا تھا۔ بعض دوسرے لوگ بد دل ہو گئے تھے ـــ الغرض بالکل ع

”دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا“

والا سماں تھا ـــــ خود راقم کے سامنے لاہور نقلِ مکانی میں دو مقصد تھے: ایک 'حلقۂ تدبرِ قرآن' میں شرکت اور مولانا کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمذ تہ کر کے ان سے استفادہ اور دوسرے اس اصل تحریکِ اسلامی کے احیاء کی سعی جو راقم کے خیال کے مطابق جماعتِ اسلامی کے انتقالِ موقف کے باعث مردہ ہو چکی تھی ـــــ لاہور آ کر اندازہ ہوا کہ مولانا 'حلقۂ تدبرِ قرآن' سے بھی بد دل ہو چکے ہیں اور اس نہج پر از سرِ نو محنت کی

© rasailojaraid.com

ہمّت اپنے اندر نہیں پاتے ـــــ اور اب سارا وقت اور ساری محنت تفسیر کی تسوید پر صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا راقم کا پہلا مقصد تو فوت ہو گیا۔ لیکن ہمّت کر کے 'تدبّر قرآن' کی جلد اوّل اس نے شائع کر دی اور مولانا نے ازراہِ شفقت اس زمانے میں برملا نہ صرف راقم سے کہا بلکہ دوسرے بہت سے احباب و رفقاء کے سامنے فرمایا کہ "یہ اس کا مجھ پر ذاتی احسان ہے"! راقم کے سامنے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اگر جلد اوّل شائع نہ ہوئی تو آگے لکھنے پر مولانا کی طبیعت مائل نہیں ہوگی اور یہ کام ادھورا رہ جائے گا ـــــ

دوسرے مقصد کے ضمن میں راقم نے اوّلاً مولوی محی الدین سلفی مرحوم کی تحریک پر اور ان کے تعاون سے اپنا اختلافی بیان "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے شائع کیا ـــــ اور بعد ازاں ایک باضابطہ دعوت کے آغاز کے لیے 'الرسالہ' کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ مولانا کو جب اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے فرمایا کہ کوئی نیا رسالہ جاری کرنے کی بجائے 'میثاق' ہی سنبھال لو۔ میں تو اسے جاری نہیں رکھ سکتا۔ تم شائع کرتے رہو گے تو کم از کم اس کا نام تو رہے گا 'اِمْتِثَالاً لِلْاَمْرِ' راقم نے بہت دوڑ دھوپ سے حاصل کیا ہوا ڈیکلریشن ضائع کر دیا اور اگست ۱۹۶۶ء سے "زیرِ سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" 'میثاق' کی ادارت سنبھال لی۔

۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے دوران 'میثاق' کے ذریعے راقم نے ایک طرف تو یہ واضح کیا کہ ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۷ء میں جماعتِ اسلامی میں جو اختلافِ رائے واقع ہوا تھا اس کی اصل نوعیت کیا تھی اور علیحدہ ہونے والے علیحدگی اختیار کرنے پر کس طرح مجبور کر دیئے گئے تھے ـــــ اور دوسری طرف علیحدہ ہونے والوں کو للکارا کہ اگر وہ جماعتِ اسلامی میں کسی شخصی عقیدت کی بنا پر نہیں بلکہ فریضۂ 'اقامتِ دین' کی ادائیگی کے لیے شامل ہوئے تھے تو جماعت سے علیحدگی سے وہ فرض تو ساقط نہیں ہو گیا۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کے لیے مجتمع ہو کر جدوجہد کریں۔ اس کا بحمد اللہ خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے بعض احباب کا ایک اجتماع رحیم یار خاں میں منعقد ہوا جس میں "ایک نئی دینی تنظیم" کے قیام کا فیصلہ

© rasailojaraid.com

کرلیا گیا۔ اس اجتماع میں مولانا بھی شریک تھے اور انہوں نے اس موقع پر بھی حسب معمول نہایت فراخدلی سے ان لوگوں کو خراج تحسین ادا کیا تھا جنہوں نے انہیں بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی تھی۔ ان کے مندرجۂ ذیل الفاظ راقم نے ستمبر اکتوبر ۱۹۶۷ء کے 'میثاق' کے کور پر نمایاں حیثیت سے شائع کئے تھے:

"عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا۔ میں اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لیے عزم و ہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دست گیری اور رہنمائی فرمائے۔

میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی کسی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں، کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے آخری دور کے لیے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اسی پر صرف کرنا چاہتا تھا چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لیے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی، میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں۔ تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہرحال اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام

© rasailojaraid.com

دوستوں کا دل سے شکرگزار ہوں جنھوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔" ———— امین احسن اصلاحی"

لیکن افسوس کہ سابقہ تمام مساعی کی طرح یہ کوشش بھی بالکل ع

"چلنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!" کے سے انداز میں ناکام ہو کر رہ گئی۔

یہ دور راقم کی زندگی میں ایک اہم موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے کہ اس وقت راقم نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب کسی 'بڑے' کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا ہے۔ اور کوئی چلے نہ چلے اور ساتھ دے نہ دے تن تنہا چلنا ہے اور اپنے سفر کا آغاز بحال کرنا ہے۔ گویا ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۷ء دس سال مولانا مودودی کے ساتھ اور ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء، دس سال مولانا اصلاحی کے ساتھ راقم کلیۃً وکاملۃً وابستہ رہا۔ لیکن ۱۹۶۸ء سے (لگ بھگ چھتیس برس کی عمر میں) اس نے آزادی کے ساتھ اپنی ڈگر پر چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تاہم بحمد اللہ، راقم اپنے ماضی سے منقطع نہیں ہوا اور اس نے ایک جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن پر اپنی تمام تر مساعی صرف کر دیں اور ان کے ذریعے اصلاً قرآن کی اس انقلابی دعوت کا پرچار کیا۔ جس کے برصغیر میں موجودہ صدی کے داعیٔ اوّل تھے مولانا ابوالکلام آزاد اور جس کے تسلسل کو برقرار رکھا تھا مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اور دوسری جانب 'دار الاشاعت الاسلامیہ' کے ذریعے اپنے جملہ وسائل و ذرائع کو کھپا دیا مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کی تصانیف کی اشاعت کے ذریعے تدبر قرآن کے اس اسلوب کی ترویج و اشاعت میں جس کے بانی ہیں مولانا حمید الدین فراہیؒ اور شارح ہیں مولانا امین احسن اصلاحی ——— لیکن اب چونکہ راقم کسی ایک لکیر کا فقیر نہیں رہا تھا لہٰذا اس کی 'سوچ' کے دوسرے اجزائے ترکیبی بھی سامنے آنے لگے۔ اور ۱۹۶۸ء سے 'میثاق' میں 'افاداتِ فراہیؒ' اور 'تدبر قرآن' کے ساتھ ساتھ جگہ ملنے لگی نہ صرف مولانا سندھی مرحوم کے تذکرے اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کے 'منشورِ اسلام' کو بلکہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے "ربانیۃ لا رھبانیۃ" اور

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

پروفیسر یوسف سلیم چشتی کے "حقیقتِ تصوّف" اور "تاریخ تصوّفِ اسلامی" ایسے مضامین کو بھی۔ اور یہی چیز سببِ اوّل بن گئی مولانا اصلاحی کی راقم الحروف کی جانب سے گرانیٔ طبع کی۔ اس لیے کہ مولانا برملا فرمایا کرتے ہیں کہ "میں تصوّف کو کُل کا کُل ضلالت و گمراہی سمجھتا ہوں!" چنانچہ مولانا نے راقم سے مشفقانہ انداز میں فرمانا شروع کیا کہ "عزیزم! تمہارے بارے میں مجھے دو اندیشے لاحق ہیں۔ ایک یہ کہ تم انتہائی ذہین ہو اور دوسرے یہ کہ تمھارے اندر تصوّف کی لٹک موجود ہے!" راقم اسے ہنس کر ٹال دیتا رہا اور مولانا کی مروّت و شرافت کہ وہ تعلّقات کو (اپنے بعض شاگردوں اور احباب کی شدید سرگرانی کے علی الرّغم) نباہتے رہے!

[illegible] ادھر تو مولانا علیل ہو گئے اور ان کی علالت تشویشناک صورت اختیار کر گئی اور اِدھر راقم کے حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن وسعت اختیار کر گئے اور اُس کے اعوان و انصار کا ایک خاصا بڑا حلقہ وجود میں آ گیا اور بالکل فطری طور پر کسی باقاعدہ ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی جس کے تحت کم از کم مالی اُمور منضبط کیے جا سکیں۔ یہی ضرورت تھی جس کے تحت "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے قیام کا فیصلہ ہوا۔ راقم اس سے بہت پہلے گہرے غور و خوض کے بعد اس حتمی نتیجے تک پہنچ چکا تھا کہ کسی دینی تنظیم میں شورائیت اس جمہوری طرز کی نہیں ہونی چاہیے جس میں بقول علامہ اقبال مرحوم ؏ "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!" بلکہ اُس طرز کی ہونی چاہیے جو اسلام کے نظامِ امارت کے ساتھ مناسبت رکھتی ہو۔ جس میں امیر صرف دستوری صدر نہیں بلکہ صاحبِ امر ہوتا ہے۔ چنانچہ بِلا خوفِ لومۃ لائم راقم نے اپنے اس خیال کو تحریر و تقریر دونوں صورتوں میں بیان بھی کیا اور انجمن کا مجوّزہ دستوری خاکہ بھی اسی نہج پر تیار کیا۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ جیسے ہی یہ ڈھانچہ "میثاق" میں شائع ہوا، مولانا بھی بفضلہٖ تعالےٰ صحتیاب ہو گئے۔ اب جو ان کے علم میں یہ خاکہ آیا تو وہ سخت برہم ہوئے اس لئے کہ اس معاملے میں بھی راقم کی اور ان کی رائے کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ نتیجۃً وہ دو طرفہ تعلّقات جو بیس سال سے نہایت خوشگوار چلے آ رہے تھے ایک شدید بحران (CRISIS) سے دوچار ہو گئے۔ بعض احباب نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی لیکن

© rasailojaraid.co

راقم نے صاف عرض کر دیا کہ اُس کی بھی یہ سوچی سمجھی رائے ہے اور اب اس میں تبدیلی صرف اس طرح پیدا ہو سکتی ہے کہ اسے دلیل سے قائل کر دیا جائے۔ محض پاسِ ادب اور لحاظِ بزرگی کی بنا پر وہ اپنی رائے تبدیل نہیں کرے گا۔ چنانچہ "ھٰذا فِراقُ بینی وبینک" کا آغاز ہوگیا اور اس کے پہلے قدم کے طور پر طے پایا کہ "میثاق" کے سرورق پر سے "زیر سرپرستی مولانا امین احسن اصلاحی" کے الفاظ حذف کر دیئے جائیں۔ تاہم یہ مولانا کی عالی ظرفی ہے کہ اس کے بعد بھی نہ صرف یہ کہ ذاتی تعلقات برقرار رہے بلکہ جزوی تعاون بھی جاری رہا۔

مارچ ۷۴ء سے انجمن خدام القرآن کی سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور اس میں راقم نے تقریباً تمام مکاتبِ فکر کے علماء کو صدارت یا خطاب کے لئے دعوت دی جسے ان کی اکثریت نے ازراہِ شفقت و عنایت منظور فرما لیا۔ یہ چیز راقم کے اور مولانا کے مابین مزید بُعد و فصل کا سبب بن گئی۔ ان کا فرمانا یہ تھا کہ "ان مولویوں کو سر پہ بٹھا کر کیا لینا ہے جو ان ہی کے خیالات و تصورات کی تو ہمیں تردید کرنی ہے!" راقم نے اسے بھی خاموشی سے سنا اَن سنا کر دیا اس لئے کہ اُس کی طبیعت کا رُخ جیسا کہ اوپر تفصیل سے بیان ہو چکا، بالکل دُوسرا ہے۔ تاہم اُس نے محسوس کر لیا کہ اب مولانا کے مزاج میں تلخی بڑھتی جا رہی ہے۔

جولائی ۷۴ء میں راقم نے اعلان کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ یہ چھوٹی سی تحریکِ اسلامی جس کا آغاز "دعوتِ رجوع الی القرآن" سے ہوا تھا اور جس نے پہلی تنظیمی ہیئت "انجمن خدام القرآن" کی صورت میں اختیار کی تھی اگلے تنظیمی مرحلے میں قدم رکھے اور ٹھیٹھ دینی اصولوں پر جماعت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ جس کا ہیولیٰ راقم کے پیشِ نظر وہی تھا جو ۶۷ء میں اجتماع رحیم یار خاں میں طے پایا تھا۔ چنانچہ 'میثاق' کی ستمبر، اکتوبر اور نومبر ۷۴ء کی اشاعتوں میں راقم نے اپنی جولائی ۷۴ء والی تقریر اور تنظیمِ اسلامی کا ۶۷ء والا خاکہ ایک طویل اداریئے سمیت شائع کر دیا۔

اس موقع پر راقم مولانا کی خدمت میں ان کے گاؤں (رحمٰن آباد) حاضر ہوا تو مولانا نے جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ ——— پرچہ کل ہی ملا تھا، بلکہ رات ہی پورا پڑھ ڈالا۔ اور رات کے دو بجے تک لالٹین کی روشنی میں اسے پڑھتا رہا۔

© rasailojaraid.com

تم نے غلا کی نشاندہی بالکل صحیح کر دی ہے ۔ اور کرنے کا کام بھی ٹھیک متعین کر دیا ہے البتہ تم نے بہت بھاری بوجھ اٹھا لیا ہے اور ایک بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ میرے اندر اس کی ہمت نہ تھی ۔ لیکن اب جبکہ تم نے یہ بوجھ اٹھا ہی لیا ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ تم اس میں ناکام ہو بلکہ دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ تمہیں کامیاب کرے ——— اس لئے کہ میں ہرگز ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو اگر خود کوئی کام نہیں کر سکتے تو کسی دوسرے کو کرتا بھی نہیں دیکھ سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مولانا کا یہی وہ حوصلہ افزا طرزِ عمل تھا جس سے راقم کو جرأت ہوئی کہ مارچ [illegible] میں جب تنظیم اسلامی کا باضابطہ قیام عمل میں آیا ۔ اور اس کا دستور طے پایا تو اس میں ایک "حلقۂ مستشارین" بھی رکھا گیا ۔ جس کی زبانی اطلاع پر تو مولانا [illegible] کراچی کے بعض دوسرے رفقاء سے یہ فرمایا کہ "آپ لوگوں نے یہ بالکل ٹھیک فیصلہ کیا ہے یہ خدمت میں بخوشی سرانجام دوں گا" ۔ لیکن جب باقاعدہ تحریری صورت میں وہ خاکہ اُن کے سامنے آیا تو انہوں نے اس میں شمولیت سے انکار فرمایا ۔ یہاں مناسب ہے کہ دستورِ تنظیم اسلامی کی وہ دفعہ پوری کی پوری نقل کر دی جائے ۔ وَھُوَ ھٰذَا :-

"دفعہ - ۵ حلقۂ مستشارین

(الف) ایسے اصحابِ علم و فضل پر مشتمل ایک حلقۂ مستشارین قائم کیا جائے گا جو کسی سبب سے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ تو شریک نہ ہوں البتہ اس کے نظریات سے مجموعی اتفاق اور اس کے مقاصد سے عمومی دلچسپی رکھتے ہوں اور یہ ذمہ داری قبول کر لیں کہ وہ عند الطلب مشورہ بھی دیتے رہیں گے اور تنظیم کی جملہ سرگرمیوں پر نگاہ بھی رکھیں گے اور اگر کہیں غلط رجحان نظر آیا تو اس پر متنبہ کر دیں گے ۔

(ب) اس حلقے میں صرف وہی اہل علم و فضل شرکت کر سکیں گے جن سے تنظیم خود درخواست کرے ۔

(ج) اس حلقے کے کوئی صاحب اگر کوئی غلط رجحان دیکھیں تو وہ اوّلاً داعیٔ عمومی کو متوجہ کریں گے اور بعد ازاں اگر ضرورت محسوس کریں تو ان کی رائے جملہ رفقائے تنظیم کے علم میں لانا ناظم عمومی کی ذمہ داری ہو گی ۔ خواہ تنظیم کے کسی

© rasailojaraid.com

آرگن میں اشاعت کے ذریعے ہو خواہ کسی سرکلر وغیرہ کے ذریعے ''

مولانا کے انکار پر راقم نے مولانا کو خط میں لکھا کہ '' میں آپ کو مجبور تو ہرگز نہیں کر سکتا لیکن یہ بات کہ تنظیم کا ایک حلقہ مستشارین ہو اور اُس میں آپ نہ ہوں مجھے گوارا نہیں ''۔ لہٰذا راقم نے رفقائے تنظیم کے مشورے سے حلقہ مستشارین ہی کو ساقط کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے بعد بھی لگ بھگ ایک سال تک مولانا کی خدمت میں راقم کی حاضری کا سلسلہ جاری رہا۔ جنوری ۷۶ء میں 'قرآن اکیڈمی' کی تعمیر کے آغاز کا مرحلہ آیا اور ساتھیوں نے اس موقع پر ایک اجتماعی دعا کا پروگرام بنایا تو اُس میں شرکت کی دعوت راقم نے مولانا کو بھی دی جسے انہوں نے کمال شفقت و مروّت سے منظور فرمالیا اور [illegible] صاحب کی معیت میں تشریف لائے۔ لیکن بعد میں بعض حضرات سے سننے میں آیا کہ مولانا نے فرمایا ہے کہ '' میری طبیعت بالکل آمادہ نہ تھی لیکن جب اُس نے کہا تو میں انکار نہ کر سکا اور مجبوراً شریک ہو گیا ''۔ راقم کی اصل مشکل یہ تھی کہ مولانا سے ملنا جلنا بھی ہو اور پھر انہیں اپنے کاموں میں شرکت کی دعوت نہ دی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ رہے سہے تعلق کو خود راقم نے ختم کر دیا ——

اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی اور حسب سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرمالیا لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر شرکت سے انکار کر دیا —— یہ گویا ان دوطرفہ تعلقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورت حال سے دوچار نہ ہوں۔ اور اس طرح ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں ع '' کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی '' کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ اب آٹھ ماہ سے صورت وہی پیدا ہو چکی ہے کہ ؎

بس اتنا سا تعلق اب ان سے رہ گیا ہے   وہ مجھ کو جانتے ہیں میں ان کو جانتا ہوں!

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

یہ طویل داستان ہماری موجودہ بحث کے اعتبار سے یقیناً جملۂ معترضہ کے حکم میں ہے۔ لیکن اسے بتمام وکمال اس لئے بیان کر دیا گیا کہ ادھر کچھ عرصے سے راقم سن رہا ہے کہ مولانا کو یہ تشویش ہے کہ راقم ان کا نام استعمال کر رہا ہے اور حال ہی میں ماہر القادری صاحب نے بھی، فاران، میں مولانا کا یہ "دکھنا سنایا"، جملہ نقل کر کے کہ "مجھے ڈاکٹر اسرار نے EXPLOIT کیا ہے!" در اصل راقم اور مولانا کے مابین اختلاف کو خود اپنے مذمومہ مقاصد کے لئے EXPLOIT کرنے کی کوشش کی ہے ——— تو جو جانتا ہے وہ تو جانتا ہی ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ ان سطور کا عاجز و ناکارہ راقم مولانا کی نظر عنایت سے قطعاً محروم ہو چکا ہے۔ مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنّف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے۔ اور اس ضمن میں بھی تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ مولانا نے تدبر قرآن کی پانچویں جلد کے حقوق طباعت جو مارچ ۷۶ء میں انجمن کو فروخت کئے تھے واپس لے لئے ہیں اور اس کی طباعت و اشاعت کا انتظام اب وہ خود فرمائیں گے لہٰذا اس ضمن میں جسے بھی کوئی رابطہ قائم کرنا ہو وہ ان ہی سے کرے!

عربی کا ایک مشہور شعر ہے:

اِنَّ الفَتٰی مَن یقول ھا انا ذا ۔۔۔ لیسَ الفتٰی مَن یقول وکانَ اَبِی!

تو راقم کو تو اگرچہ فتوّت کا کوئی دعویٰ سرے سے ہے ہی نہیں۔ تاہم اُس نے نہ صرف یہ کہ اپنی ذاتی خوش بختیوں اور محرومیوں کی مفصل داستان اوپر رقم کر دی ہے بلکہ اپنے فکری "آباد و اجداد" کی پوری تفصیل بھی بیان کر دی ہے:

افسوس اس کا ہے کہ ہمارے یہاں دوسرے تمام حقوق کے مانند "اختلافِ رائے" کا حق بھی مانگتے تو سب ہیں دینے کو کوئی تیار نہیں اور ہر بڑا شخص "ولا غیری" کے سے انداز میں کُلّی متابعت اور کامل پیروی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس ضمن میں اوپر علماء کرام کے بارے میں مولانا اصلاحی کا قول تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں۔ مولانا بنوری صاحب نے بھی ایک بار فرمایا کہ "ذاتی حیثیت میں آپ مجھے بہت عزیز ہیں، آپ جب بھی مشورہ طلب کریں گے میں پوری توجہ کروں گا۔

© rasailojaraid.co

لیکن تنظیمِ اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شرکت سے میں اس لئے معذور ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے میرے پاس نہ فرصت ہے نہ صحت ـــــ ویسے یہ بات بھی ہے کہ آپ مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہم ان کے معلّمِ اوّل امام ابن تیمیہؒ کو علم کا بحرِ ذخار ماننے کے باوجود اہمیت نہیں دیتے تو ان لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے!"

نتیجہ یہ ہے کہ علماء کرام راقم سے اس لئے ناراض ہیں کہ وہ اس دور کا اصل "ترجمان القرآن" علامہ اقبال کو کیوں قرار دیتا ہے۔ اور علامہ مرحوم کے عقیدتمند اس لئے خفا ہیں کہ وہ ان کے نام کے ساتھ "حضرت" اور "رحمۃ اللہ علیہ" کے سابقے اور لاحقے کیوں نہیں لکھتا اور "مولانا" تھانوی حلقے اس لئے ناراض ہیں کہ شخصاً راقم کو عقیدت حضرت مولانا محمود حسنؒ اور مولانا مدنی رح سے ہے اور حضرت مدنیؒ کے عقیدتمند اس لئے خفا ہیں کہ راقم اُن کی سیاسی حکمتِ عملی پر کیوں تنقید کرتا ہے۔

الغرض معاملہ وہ ہے کہ ؎

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ۔۔۔ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند!

مزید برآں احناف کے نزدیک راقم "وہابی" ہے اور اہلحدیث حضرات کے نزدیک "حنفی" ـــــ گویا ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا ۔۔۔ اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

اور نوبت بایں جا رسید کہ منکرِ حدیث ہونے کی تہمت تو خاصے عرصے سے لگ ہی رہی تھی، اب سننے میں آیا ہے کہ اس خاکسار کے قادیانی ہونے کی "خبر" بھی بعض حضرات نے اہتمام کے ساتھ دُور دُور تک پہنچائی ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ!

راقم کے لئے اس صورتِ حال میں دوہری نوید ہے۔ ایک تو اس کی کہ اس میں اسے "وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا" (آل عمران: ۱۸۶) کا عکس نظر آتا ہے اور دوسرے اس کی کہ یہ علامت [illegible] کی مساعی بار آور ہو رہی ہیں اور اس کی دعوت [illegible] موجود ہے یعنی انہیں اور دشنام

طرازیاں تو گویا اس راہ کے ابتدائی سنگ ہائے میل اور نشاناتِ راہ ہیں ــــ
هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ــــ
(الاحزاب : ۲۲) رہی بزرگوں کی نگاہِ التفات اور نظرِ کرم سے محرومی تو اس
باب میں بھی راقم مطمئن ہے کہ ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا   میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں! (اکبر)

ویسے راقم بحمد اللہ حضرتِ اکبرؔ ہی کے اس شعر کہ ؎

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا   عالم ہے ان گلوں میں بھولوں میں بستیاں ہیں!

اور فیض کے اس شعر کہ ؎

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیمِ صبحِ وطن   یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے!

اور اقبال کے اس شعر کہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں   یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں.

کے مصداق بالکل یکہ و تنہا بھی نہیں ہے۔ بلکہ اسے اللہ نے ہمراہیوں اور ہمسفروں کی ایک معتدبہ تعداد اور اعوان و انصار کی اچھی بھلی جمعیت عطا فرما دی ہے اور اس کی دس سالہ مساعی کو ربّ العٰلمین نے اس درجہ بار آور کیا ہے اور ایسا شرفِ قبول عطا فرمایا ہے کہ راقم خود حیران ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ راقم پر علامہ اقبال کے ان اشعار کی صداقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی ہے کہ ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں   راہ دکھلائیں کسے؟ رہروِ منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہرِ قابل ہی نہیں   جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گِل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں   ڈھونڈنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں
اور نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے   ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

چنانچہ لاہور، کراچی اور سکھر تو راقم کی دعوتِ قرآنی اور درسِ قرآن کے بڑے مراکز رہے ہی ہیں، گذشتہ دس سالوں کے دوران راقم اس پیغام کو لے کر ایک جانب گوجرانوالہ، شیخوپورہ، وزیر آباد، گجرات، جہلم، سرگودھا، جوہر آباد، راولپنڈی، اسلام آباد، واہ، ٹیکسلا اور تربیلہ تک گیا ہے اور دوسری جانب

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

ساہیوال، ملتان، بہاولپور، رحیم یار خاں، صادق آباد، حیدر آباد اور کوئٹہ تک،
——— اور نہ صرف یہ کہ تین عظیم الشان سالانہ قرآن کانفرنسیں منعقد ہو چکی
ہیں بلکہ لاہور اور کراچی میں دو دو بار، اور کوئٹہ اور راولپنڈی میں ایک ایک بار
قرآنی تربیت گاہیں قائم کی جا چکی ہیں ——— اور ان پر مستزاد ہیں سلسلۂ مطبوعات[1]
کے ذریعے دعوتِ قرآنی کی توسیع اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعے
لوگوں کی توجہات کو قرآن حکیم کے جانب منعطف کرنے کی کوششیں مثلاً لاہور کے
عوامی میلوں، رائے ونڈ کے تبلیغی اجتماعات اور یوم اقبال کی تقریبات میں اخباری
اشتہاروں، پوسٹروں اور ہینڈ بلوں کے علاوہ دس دس ہزار کی تعداد میں "دعوت الی اللہ"
اور "راہ نجات" ایسے کتابچوں کی تقسیم۔ اور آخری مگر کمترین نہیں، قرآن اکیڈمی
کی تعمیر کا آغاز جس پر ان سطور کی تحریر کے وقت تک کم و بیش پانچ لاکھ روپیہ صرف
ہو چکا ہے ——— اور ان سب کا حاصل یہ کہ "درس قرآن" کا چرچا تو
بحمد اللہ دُور دُور تک ہے ہی کم از کم پاکستان کے طول و عرض میں راقم کا نام
"دعوت رجوع الی القرآن" کی علامت بن گیا ہے! ذالک فضل اللہ یوتیہ
من یشاءُ۔

ع این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

مزید برآں ——— اور نافلۃً لک کے درجے میں یہ کہ "تنظیم اسلامی"
کے نام سے ایک چھوٹا سا قافلہ فرمان نبوی "اِنّی اٰمرکم بخمس":

---

۱ جس میں امام فراہی اور مولانا اصلاحی کی گرانقدر تصانیف کے علاوہ شامل ہیں راقم
کے مختصر کتابچے بھی، جن میں سے ایک یعنی "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کا ذکر تو اوپر ہو چکا ہے۔
لیکن دوسرے یعنی "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا ذکر نہیں ہو پایا۔ حالانکہ اس کے
ذکر کے بغیر یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا۔ اس لئے کہ نہ صرف یہ کہ بحمد اللہ اس کے پانچ
ایڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں بلکہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا پروفیسر محمد ابراہیم
مرحوم نے حد درجہ عقیدت و احترام کے جذبات کے ساتھ اور عربی میں کیا مولانا
صہیب حسن السلفی نے یہ کہہ کر کہ "اس کو پڑھنے سے خود مجھ پر جو اثر ہوا اس سے
میں نے سوچا کہ اگر کسی کتابچے سے ایک "مولوی" بھی متاثر ہو سکتا ہے تو عوام کے
حق میں تو وہ لازماً تریاق ہوگا"۔

© rasailojaraid.com

بِالْجَمَاعَۃِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ وَالْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ"

میں بیان شدہ مقاصد کے پیش نظر سفر کا آغاز کر چکا ہے اور اس راہ کے پہلے اقدام یعنی تجدید ایمان، توبہ اور تجدید عہد کی دعوت زبانوں پر آنے اور کانوں سے ٹکرانے لگی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قافلہ بھی بہت ہی چھوٹا ہے اور اس کا قائد بھی حد درجہ حقیر پُر تقصیر۔ لیکن یہ اطمینان پوری طرح حاصل ہے کہ کرنے کا کام ہے یہی! ؎

آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہل فراق کیلئے عیش دوام ہے یہی!

راقم کو جو ساتھی ملے ہیں وہ راقم کے لئے اللہ کا عطیہ ہیں۔ اور راقم تو قائل ہی اس کا ہے کہ ع "ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است!" اگر کبھی ان سے کسی کی سست رفتاری یا سہل انگاری سامنے آتی ہے تو راقم اپنے آپ سے کہتا ہے کہ ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی!

اور یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ جب کسی ساتھی سے کسی کمزوری کا ظہور ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ لامحالہ اس کی اپنی ہی کسی کمزوری کا مظہر ہے!۔

اور سب سے بڑھ کر اطمینان بخش بات یہ ہے کہ اس دعوت کا آغاز نہ کسی مصنف کی تصانیف سے ہوا نہ کسی خطیب کے خطبات و تقاریر سے بلکہ بحمداللہ درس قرآن، سے ہوا۔ اور اب بھی اس کا دار و مدار اور مرکز و محور ہے اللہ کی کتاب! —— اور اللہ کی کتاب کی ترجمانی اور افہام و تفہیم میں بھی بفضلہ تعالیٰ وعونہٖ، کسی ایک لکیر کی فقیری نہیں بلکہ ابوالکلام اور ابوالاعلیٰ کی دعوتِ جہاد کا عنصر بھی شامل ہے اور فراہیؒ اور اصلاحی کے تفکر و تدبر[1] کا جوہر بھی، اور شیخ الہندؒ اور شیخ الاسلامؒ کے احوالِ باطنی و نکاتِ روحانی کی چاشنی بھی

---

[1] یہ بات اب تو یقیناً مولانا اصلاحی اور ان کے بعض شاگردوں کو بہت ناگوار ہو گی۔ لیکن غالباً مولانا بھولے نہ ہوں گے جناب وحیدالدین خاں صاحب کی شہادت جو انہوں نے راقم کے بعض دروس میں شمولیت کے بعد مولانا کے سامنے دی تھی کہ راقم کے درس میں فکر فراہیؒ کے اثرات سموئے ہوئے ہیں اور اگر یہ یاد نہ ہو تو بھی مولانا کے اپنے وہ الفاظ تو مطبوعہ موجود ہیں جو انہوں نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" پر تقریظ میں تحریر فرمائے تھے کہ —— "اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے قلم میں برکت دے کہ وہ ایسی بہت سی چیزیں لکھنے کی توفیق پائیں۔ ہماری بہت سی عزیز

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے)

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

موجود ہے اور ڈاکٹر اقبال کے جذبہ ملّی کی حرارت اور ان کی اور ڈاکٹر رفیع الدین کی علوم جدیدہ اور فکر جدید پر قرآن حکیم کی روشنی میں جرح و تنقید کی کڑ دی گونین بھی! ـــــــــ یہی وجہ ہے کہ ناقدین نے تو یہ کہا کہ "آپ کے درس کے بارے میں یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ اس سے ہر شخص کچھ نہ کچھ ضرور لے کر اٹھتا ہے"[۱] اور احباب کا کہنا یہ ہے کہ اس میں حد درجہ 'جامعیت' ہوتی ہے ـــــــ اگر ان کا خیال کسی بھی درجے میں صحیح ہے اور جامعیت سے کوئی حصّہ راقم کو فی الواقع ملا ہے تو یہ سرسر افیض ہے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے اُنسِ قلبی، مناسبت ذہنی اور کسی درجے میں نسبتِ رُوحانی کا۔ اور اگر ان کا خیال مطابقِ واقعہ نہیں تب بھی راقم رب العزت سے خواستگار ہے کہ وہ اسے اُس جامعیت کا اسی طرح سے قلیل ہی سہی مگر کچھ نہ کچھ حصہ ضرور عطا فرما دے جس کا مظہر اتم تھے بارھویں صدی ہجری میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی اور چودھویں صدی ہجری میں شیخ الہند محمود حسن دیوبندی ـــــــ گویا بقول اقبال سے

"میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر!"

اور ظاہر ہے کہ اللہ کی شانِ کریمی سے یہ بعید بھی نہیں۔

ع "دو شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!"

□□□□□□□□□□

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

اُمیدیں ان سے وابستہ ہیں"، عجب اتفاق ہے کہ اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا حمید الدین فراہی کی وفات پر تعزیتی مضمون میں ان کے تلامذہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا اصلاحی کے بارے میں لکھے تھے کہ "... جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں"

[۱] یہ الفاظ ہیں مولانا اصلاحی کے شاگرد رشید جناب خالد مسعود صاحب کے برادر نسبتی ڈاکٹر انوار احمد بگوی کے جو راقم کے کرم فرماؤں، اور شدید ناقدوں میں سے

© rasailojaraid.com